Physical Education, Health and Social Sciences

https://journal-of-social-education.org

E-ISSN: 2958-5996

P-ISSN: 2958-5988

Sobha Faqeer in Soofi Reflections

صوفیانہ روایات کی تصویر ، سوبھا فقیر

Talib Hussain Khokhar

Lecturer, Government Degree College Mirpur Mathelo, College Education Department Government of Sindh, Pakistan. Email: talibhussainkhokhar786@gmail.com

DOI: https://doi.org/10.63163/jpehss.v3i4.721

Abstract*:* The Sufi tradition represents a profound spiritual and intellectual dimension within Islamic civilization. Rooted in the pursuit of divine love (Ishq-e-Haqiqi), self-purification, and moral refinement, it transcends sectarian and cultural boundaries to emphasize the unity of all human beings. Historically, Sufism has shaped not only personal spirituality but also social ethics, interfaith harmony, and artistic expression through literature, poetry, and music. Within this heritage, the Sindhi Sufi poet Soobha Faqir (1235–1325 AH) occupies a distinguished position. His works embody the synthesis of divine and human love, humility, and the continuous search for truth through devotion and self-annihilation in God. His poetic collection, Diwan-e-Dard-e-Ishq, demonstrates a remarkable fusion of metaphysical insight, moral philosophy, and linguistic beauty.

This research critically examines the Sufi philosophy in Soobha Faqir's poetry, highlighting the concepts of wahdat al-wujud (unity of being), divine union, and universal brotherhood. Through a close reading of his verses in Sindhi, Urdu, and Saraiki, the study explores how Soobha Faqir's message of love and tolerance resonates with the broader tradition of mystics such as Mansur al-Hallaj and Maulana Rumi. His portrayal of spiritual sacrifice and devotion reflects a deep engagement with Islamic metaphysics and human ethics. Moreover, the research situates Soobha Faqir's thought within the pluralistic cultural milieu of Sindh, where Sufi ideals foster social cohesion and compassion across religious lines. Ultimately, this paper argues that Soobha Faqir's poetic vision revitalizes the timeless message of Sufism a call toward peace, divine love, and the moral awakening of humanity in an era of materialism and spiritual fragmentation

صوفیانہ روایت اسلام کی فکری، روحانی اور تہذیبی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور روشن باب ہے۔ اس روایت کی بنیاد انسان اور خدا کے درمیان قرب، محبت، معرفت اور روحانی بالیدگی کی جستجو پر قائم ہے۔ صوفیاء نے اپنی تعلیمات اور عملی زندگی کے ذریعے تزکیۂ نفس، ایثار، محبتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کو دین کے حقیقی تقاضے قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ روایت نہ صرف ایک روحانی نظام ہے بلکہ ایک سماجی و تہذیبی تحریک بھی رہی ہے۔

ابتدائی اسلامی صدیوں میں یہ روایت زہد و تقویٰ کی تحریکوں سے شروع ہوئی لیکن جلد ہی یہ انفرادی ریاضت سے بڑھ کر ایک منظم فکری و روحانی نظام کی صورت اختیار کر گئی۔ بغداد، خراسان، اندلس، شام اور برصغیر جیسے خطے اس روایت کے بڑے مراکز بنے۔ صوفیاء نے وحدتِ وجود اور وحدت الشہود جیسے نظریات کے ذریعے انسان اور کائنات کے تعلق کو نئے زاویے سے سمجھایا۔ صوفیانہ روایت کے بنیادی اصولوں میں توحید کا عملی شعور، خدا اور مخلوق سے محبت، نفس کی تطہیر، معرفت کی جستجو اور مسلسل ریاضت شامل ہیں۔ ان اصولوں کے تحت صوفیاء نے انسان کو یہ درس دیا کہ اصل کامیابی اپنی انا اور خواہشات کو ختم کرکے خالقِ حقیقی سے قرب حاصل کرنا ہے۔

اس روایت نے ادب، شاعری، موسیقی اور فنونِ لطیفہ پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ مولانا جلال الدین رومی، ابن عربی، منصور حلاج، بایزید بسطامی، شاہ عبداللطیف بھٹائی، بلھے شاہ اور وارث شاہ جیسے صوفی شعرا نے اپنے کلام کے ذریعے

عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کو انسانی روح کی کیفیتوں کے ساتھ جوڑا۔ ان کی شاعری میں محبت، حسن، جمال اور معرفت کے استعارے نمایاں ہیں جو آج بھی دلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر صوفیانہ روایت نے مختلف مذاہب، قوموں اور طبقات کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔ برصغیر میں صوفی خانقاہیں مذہبی رواداری، بھائی چارے اور بین المذاہب ہم آہنگی کی علامت بن گئیں۔ صوفیاء نے انسانیت کو سب سے بڑی قدر قرار دیا اور طبقاتی و لسانی تفریق کو رد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ماننے والے ہر طبقے اور ہر مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

آج کے دور میں جب معاشرے میں شدت پسندی، انتہاپسندی اور بے سکونی بڑھ رہی ہے، صوفیانہ روایت امن، محبت، برداشت اور باہمی احترام کا عملی پیغام دیتی ہے۔ یہ روایت نوجوان نسل کے لیے باطنی سکون، فکری بالیدگی اور معاشرتی ہم آہنگی کا سرچشمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ صوفی کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہر زمانے میں صوفیاء کرام نے اپنے ذاتی علم و تجربے اور روحانی ذوق کے مطابق تصوف کی تعریفیں کی ہیں۔ اگرچہ یہ تعریفی انداز مختلف ہیں، مگر سب میں بنیادی نقطۂ نظر انسانیت کی خدمت اور اس کی عظمت ہی ہے۔امام غزالی کے نزدیک تصوف کی تعریف محض عقیدہ یا نظریہ نہیں بلکہ علم و عمل کے امتزاج پر مبنی ہے۔ ان کے مطابق ... "تصوف کا بنیادی مقصد انسان کو نفسانی خواہشات سے دور رکھنا، تزکیۂ نفس کے ذریعے باطن کو پاکیزہ بنانا اور قلب کو غیر اللہ کے اثرات سے خالی کر کے ذکرِ الٰہی سے منور کرنا ہے۔ اس طرح تصوف فرد کی داخلی اصلاح اور روحانی ارتقاء کا عملی طریقہ قرار پاتا ہے" (فاروقی۱)

شیخ ابوالحسن نوری کی نظر میں تصوف نہ تو محض رسومات کا مجموعہ ہے اور نہ ہی محض علوم کا ذخیرہ، بلکہ اس کی اصل روح اخلاقیات پر مبنی ہے۔ اگر یہ صرف رسم و رواج پر مشتمل ہوتا تو محض مجاہدے سے حاصل کیا جا سکتا تھا، اور اگر صرف علمی جہت رکھتا تو محض تعلیم و تعلم سے ممکن ہوتا۔ ان کے اس مؤقف سے واضح ہوتا ہے کہ تصوف کی بنیاد عملی اخلاق اور سلوکِ حیات پر ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد تعریفیں ملتی ہیں جو صوفیانہ طرزِ فکر اور روایات کو جلا بخشتی ہیں اور ایک طالب کو زہد، توکل، محبت اور دینی معاملات میں بلند مرتبے تک پہنچنے کا راستہ دکھاتی ہیں۔

مزید برآں، لفظ "صوفی" پر تحقیق سے دو بنیادی اور مستند نتائج سامنے آتے ہیں جو اس کی معنوی اور تاریخی جہت کو مزید واضح کرتے ہیں۔ "یورپی مستشرقین نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ تصوف کی جڑیں "نو افلاطونیت" میں پیوست ہیں اور اس پر یونانی فلسفے کے اثرات نمایاں ہیں۔ تاہم اس مؤقف کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ "صوفی" خالصتاً ایک عربی لفظ ہے اور اسے کسی یونانی زبان سے ماخوذ قرار دینا علمی طور پر محلِ نظر ہے۔ اسی طرح صوفیانہ افکار کو براہِ راست یونانی تہذیب سے مستعار سمجھنا بھی حقیقت کے منافی ہے۔ تاریخی شواہد کے مطابق، عباسی دور میں افلاطون اور دیگر یونانی فلسفیوں کی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ ضرور ہوا، لیکن ان میں کوئی ایسی تحریر موجود نہیں تھی جو تصوف سے متعلق براہِ راست ہو" (فاروقی۲)

امام غزالی نے تصوف کو علم و عمل کا امتزاج قرار دیا ہے، لیکن عصرِ حاضر میں تصوف کے ساتھ رہبانیت اور فراریت کے رجحانات وابستہ ہو چکے ہیں۔ ایسے افراد بھی صوفی یا فقیر کہلاتے ہیں جو اپنی دنیوی و سماجی ذمہ داریوں سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ تاریخی طور پر خانقاہی روایت کے اکابرین ایک مکمل اور عملی صوفیانہ زندگی بسر کر چکے تھے۔ ان کی شاعری، اقوال اور طرزِ حیات دراصل ایک کامیاب اور بامقصد زندگی کی راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ تصوف کی ابتدا اور روایات کے بارے میں اگرچہ مختلف آراء اور تاریخی بحثیں موجود ہیں، لیکن محققین کے نزدیک اس کے اصل ماخذ کو سمجھنے کے لیے قرآنِ مجید کے مطالعے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

"تصوف کی بنیاد دراصل بعثتِ نبوی کے ساتھ ہی رکھ دی گئی تھی۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن کی آیات کی تلاوت، تزکیۂ نفس اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے ذریعے اخلاقِ حسنہ کی تکمیل تھا۔ سورۃ المزمل کی ابتدائی گیارہ آیات میں جو ہدایات دی گئی ہیں، انہیں تصوف کا نچوڑ قرار دینا بجا ہوگا، کیونکہ ان آیات میں ذکرِ الٰہی، صبر، روحانی تربیت اور عملی تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ تصوف کسی بیرونی ماخذ سے نہیں بلکہ براہِ راست قرآنِ مجید سے ماخوذ ہے" (فاروقی ۳)

تصوف کی آسان تشریح یہ ہے کہ اس کا مقصد محض تزکیۂ نفس نہیں بلکہ دوسروں کے لیے نفع رسانی بھی ہے۔ ایک حقیقی صوفی اپنی ذاتی ریاضت کے ساتھ ساتھ معاشرے کو فائدہ پہنچانے کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، خواہ اس کا عمل بظاہر عام لوگوں کی نظر میں چھوٹا یا معمولی ہی کیوں نہ دکھائی دے۔

"یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ صوفیاء نے دوستی، اخوت اور خدمتِ خلق کے جو اصول بیان کیے، وہ صرف نظری سطح تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کی عملی زندگی میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سلسلۂ طریقت بیرامیہ کے بانی حاجی بیرام ولیؒ (وفات 1430ء) کا معمول یہ تھا کہ وہ خود امیروں سے صدقات وصول کرتے اور انہیں غریبوں

اور محتاجوں میں تقسیم کرتے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے مریدوں کو بھی ساتھ شامل کرتے تاکہ ایک طرف درویشوں کے دلوں سے غرور، تکبر اور خود نمائی کے رجحانات ختم ہوں اور دوسری طرف غرباء و مساکین کی ضروریات پوری ہو سکیں (خشک۴)

دنیا کی ہر قوم اور ہر خطے کی اپنی ایک الگ پہچان اور پیغام ہوتا ہے، مگر ضلع گھوٹکی اپنی جغرافیائی حیثیت اور تاریخی پس منظر کے باعث ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ خطہ مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے سنگم کے طور پر سامنے آتا ہے، جہاں مسلمان، ہندو، سکھ، مارواڑی، سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کے عقائد الگ الگ ہیں، لیکن سندھ کی سرزمین پر رہنے کے باعث ان سب میں رواداری اور ہم آہنگی کا جذبہ مشترکہ ہے۔ یہ رواداری دراصل یہاں کے صوفی بزرگوں کی تعلیمات کا نتیجہ ہے جنھوں نے مذہب اور فرقے سے بالاتر ہو کر انسانیت کو مرکزی قدر کے طور پر پیش کیا۔ اسی حقیقت کو مصری شاہ کے قول میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ: ''عشق ہی اصل اسلام ہے، محبت ہی اصل مذہب ہے، اور یہی سب سے بڑی نعمت ہے۔'' اس تناظر میں یہ بات اہم ہے کہ کسی بھی قوم یا ملک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو غلط یا کمتر قرار دے۔

"مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا ایک دوسرے کو غلط قرار دینا درست رویہ نہیں ہے، کیونکہ خود قرآنِ مجید نے بھی اس طرزِ عمل کی مخالفت کی ہے" (خادم۵)

ضلع گھوٹکی کے صوفی منش اولیاء کرام نے اپنی شاعری اور تعلیمات کے ذریعے معاشرتی تفریق، ذات پات، رنگ و نسل اور مذہبی اختلافات کی بنیاد پر قائم رکاوٹوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انہی بزرگوں میں فقیر سوبھا لغاری بھی شامل ہیں۔ تاریخی روایات کے مطابق 1235ء میں احمد لغاری کے گھر ایک فرزند پیدا ہوا جس کا نام ''سوبھا'' رکھا گیا، جس کے معنی کامیاب اور سرخرو کے ہیں۔ احمد لغاری تعلقہ ڈہرکی کے گاؤں داؤدوالہ میں سکونت پذیر تھے، جو ریلوے اسٹیشن سے تقریباً تیس کلومیٹر شمال کی سمت واقع ہے۔ سوبھا فقیر کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے مزید تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے بھی نوازا۔ بعد ازاں ان کے خاندان کے کئی افراد داؤدوالہ سے ہجرت کر کے گاؤں داد لغاری منتقل ہوگئے، جہاں ان کے متعدد رشتہ دار پہلے سے مقیم تھے۔

تعلیم کے ابتدائی مراحل میں ہی فقیر سوبھا نے ناظرہ قرآن مجید مکمل کر لیا تھا، اس کے علاوہ وہ فارسی کی کلاسیکی تصانیف گلستان اور بوستان کے مطالعہ سے بھی فیض یاب ہوئے۔ سوبھا فقیر کی شخصیت ظاہری و باطنی حسن کا امتزاج تھی۔ آپ کا قد درمیانہ، رنگ گندمی اور اعضائے جسمانی نہایت متناسب اور پرکشش تھے فقیر سوبھا لغاری زمانۂ طفولیت ہی سے ایک وجدانی اور مستانہ طبیعت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت پر ابتدا ہی سے جوش و جذبہ غالب رہا، جسے فرو کرنے کے لیے وہ جوگیوں کی معیت میں مختلف اسفار پر روانہ ہوئے۔ جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں کی سیاحت کرتے ہوئے وہ بغداد تک جا پہنچے، تاہم وہاں انہیں روحانی تسکین حاصل نہ ہوسکی اور بالآخر وطن واپس آنا پڑا۔

" سوبھا فقیر کو عشقِ حقیقی کے اس درد کا مداوا تلاش کرنے کے لیے وہ مردانِ خدا کی جستجو میں رہے۔ اس دوران وہ مہیسرہ ریلوے اسٹیشن کے جنوب میں واقع ایک بزرگ کے مزار پر قیام پذیر ہوگئے، جہاں دن کے اوقات میں محنت و مشقت کرتے اور رات کو ذکر و عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ایک شب انہیں ایک روحانی مشاہدہ ہوا، جس میں انہوں نے شیر کی صورت دیکھی۔ انہوں نے دلیرانہ انداز میں مخاطب ہو کر کہا کہ اپنی حقیقی صورت میں ظاہر ہو، سوبھا خوفزدہ نہیں۔ اسی تجربے کے نتیجے میں انہیں اپنے مرشد کا سراغ ملا اور خواب میں ان کی زیارت بھی ہوئی۔ بعد ازاں وہ حضرت پیر محمد عارف سیڑؒ (فیض محل والہ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے فیض حاصل کیا۔ واپس آ کر سندھ میں فیض محل والہ کی تعلیمات کو عام کیا، جس کے نتیجے میں کثیر تعداد میں لوگ ان کے ساتھ پیر محمد عارف سیڑؒ کے سلسلے سے منسلک ہوگئے" (سوبھا۶)

فقیر سوبھا لغاری کی روحانی زندگی میں مجلسِ سماع کو نمایاں اہمیت حاصل تھی۔ وہ اپنے ہم نوا فقراء کے ساتھ مل کر راگ و نغمہ کی محفلیں گرماتے اور خود بھی بوقتِ ضرورت نغمہ سرائی کرتے۔ ان کے گانے میں غیر معمولی اثر انگیزی تھی جس کے باعث سامعین محویت و سرور کی کیفیت میں ڈوب جاتے۔ فقیر سوبھا سماع کو محض تفریح نہیں بلکہ ایک روحانی عبادت تصور کرتے تھے، اور سلسلۂ محل کے دیگر مشائخ کی طرح سماع کے دوران گریہ و زاری ان کے معمولات کا حصہ تھا۔ ان کی طبیعت ہمیشہ عبادت گزاری کی طرف مائل رہتی اور وہ شرعی احکام کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ سنتِ نبویؐ کی سختی سے پیروی کرتے تھے۔ فقیرانہ مزاج کی بدولت ان کی طبیعت رشتہ داروں سے کم میل کھاتی تھی، لہٰذا وہ گاؤں عالمانی میں اپنے پیر بھائیوں کے ساتھ سکونت پذیر ہوئے۔ بعد ازاں کچھ عرصہ انہوں نے لوہی کے مقام پر اپنے پیر بھائیوں کے ہمراہ قیام کیا جہاں ان کے ساتھ کمال کی دلجوئی اور رفاقت کی گئی۔ اس عرصے میں وہ اسماعیل فقیر کوری کے پاس مقیم رہے۔ وہاں ایک نیک سیرت خاتون کی موجودگی نے انہیں روحانی قرار و تسکین عطا کیا، اور انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ اس خاتون کی محبت و الفت میں گزارا۔ تاہم قضا و قدر کے فیصلے کے تحت وہ نیک بانو وفات پاگئیں، جس کے بعد فقیر سوبھا دوبارہ عالمانی گاؤں لوٹ گئے اور وہیں قیام کو ترجیح دی

"گاؤں عالمانی میں ایک نیک سیرت خاتون، دُرناز صاحبہ عرفان سکونت پذیر تھیں۔ فقیر سوبھا نے ان کی صالح طبیعت اور نیک سیرت سے متاثر ہو کر وہیں مستقل قیام اختیار کیا اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک اسی مقام پر مقیم رہے۔ یہ مستقل قیام اور آخری وقت تک اسی بستی میں رہنا دراصل فقیر سوبھا کی وفاداری اور روحانی وابستگی کا مظہر ہے، جس کی علامت آج بھی ان کا مزار ہے جو اسی جگہ نشانِ عبرت و عقیدت کے طور پر موجود ہے" (بلوچ ۷)

سوبھا فقیر کا مجموعۂ کلام بعنوان "دیوانِ دردِ عشق" زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں شامل ایک کافی میں نظیر اکبر آبادی کے مشہور مطلع کو بطور تھل (یعنی مطلع) اختیار کیا گیا ہے۔ یہ مطلع درج ذیل ہے، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ یہ طرزِ انتخاب اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ سوبھا فقیر نے اپنی شاعری میں کلاسیکی شعری روایت سے رشتہ استوار رکھا اور بالخصوص نظیر اکبر آبادی کی فکر سے استفادہ کیا، جو زندگی کی ناپائیداری اور فنا پذیری کے احساس کو اجاگر کرتی ہے "سب رمزے نخرے چل گئے رٹھڑے داجل کون رجھاوے گا آوت جاوت چل گئے راگت، بینت کون بجاوے گا ذہانت، خیانت جل گی امانت، "سوبھل" کون سڈاوے گا" (سوبھا۸)

سوبھا فقیر ، صوفی شاعر خواجہ میر درد سے پہلے دنیا کی بے ثباتی کو بیان کر چکے تھے ،کہ یہ دنیا مستقل رہنے کی جگہ نہیں ہے یہاں جو آیا ہے اس کو جانا ہے۔اس دنیا کے سارے رنگ کچے ہیں ان کو آخر مٹ جانا ہے ،سوبھا فقیر کے اس نظریے کے بعد خواجہ میر درد نے اس نظریے کو مزید تقویت بخشی اور اور ثبوت کے طور پر کہا کہ۔ "دنیا میں کون نہ یکبار ہو گیا پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا"(درد۹)

مطلب جو شخص اس دنیا سے چلا جاتا ہے پھر یہاں واپس نہیں آتا اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ دنیا اتنی اچھی ہے نہ اتنی پائیدار اور جانے والا اس کی حقیقت کو سمجھ جاتا ہے کہ، بظاہر یہ بہت رنگین ہے مگر اس کے سارے رنگوں میں سے کسی ایک رنگ کو بھی ثبات نہیں ۔ سوبھا فقیر ہو یا خواجہ میر درد اس دنیا کے متعلق دونوں کے خیالات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

سوبھا فقیر کے آباؤ اجداد کا تعلق ریاست بہاولپور سے تھا، جو بعد ازاں ہجرت کر کے سندھ میں آ کر آباد ہوئے۔ سوبھا فقیر نے نہایت کم عمری سے ہی عشقِ مجاز کے تجربات کا سامنا کیا۔ عشقِ مجاز کی کیفیات اپنی ذات میں ایک پرجوش اور پیچیدہ جہان ہیں، جن کی حقیقت اور انجام کسی کے لیے بھی مکمل طور پر قابلِ ادراک نہیں۔ یہ ایک بے کنار اور بیکراں سمندر کی مانند ہے جس کا صحیح حال صرف وہی جان سکتا ہے جو اس میں مبتلا ہو۔

سوبھا فقیر کو عرفان و مجاز دونوں میدانوں میں مہارت حاصل تھی۔ وہ طریقت کے جستجو گر، ایک شائق و طائرِ طریقت، انسان دوست اور ہمدرد شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی حیات کے آخری ایام عالمانیوں کے گاؤں میں گزرے، جہاں ۹۰ برس کی عمر میں، ۲۱ ذوالقعد ۱۳۲۵ھ کو ان کا وصال ہوا۔ ان کی یاد میں ہر سال اسی تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے، جو ان کی روحانی و شعری خدمات کا اعتراف ہے۔

سوبھا فقیر کی شاعری کئی لسانی جہات پر محیط ہے۔ انہوں نے کافی کے ساتھ ساتھ اردو، ملتانی، سرائیکی اور سندھی زبانوں میں بھی کلام کہا۔ تاہم ان کی تخلیقات پر سب سے نمایاں اثر اردو زبان کا دکھائی دیتا ہے۔ متعدد اشعار مکمل طور پر اردو میں ملتے ہیں جبکہ دیگر زبانوں کے کلام میں بھی اردو کی آمیزش نمایاں ہے۔ یہ لسانی تنوع نہ صرف ان کی وسعتِ ذوق کی علامت ہے بلکہ ان کے عہد کی لسانی و ثقافتی ہم آہنگی کا بھی مظہر ہے

مثال: "کارن پیر فقیر فراقی ---------رانجھن رمز لگاتا ہے۔

تلک پیشانی گلے میں مالہا ---------درد ر بین بجاتا ہے۔

رنگپور کے رنگ دیکھنے کو ------رنگ بھبھوت بناتا ہے۔

سوبھا درد والوں کے دل میں -------برہ کی آگ جلاتا ہے" (سوبھا ۱۰)

سوبھا فقیر کی شاعری کا بڑا حصہ "کافی" کی صورت میں محفوظ ہے، تاہم کافی کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعاتی نظموں کو بھی تخلیق کیا ہے، جن میں کنگن، رٹھڑا، آٹھ دن اور چھلا قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح مدحیہ شاعری میں انہوں نے حضرت محکم الدین اور حضرت محمد عارف کی مدح کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں قصہ گوئی کی جھلک بھی نمایاں ہے، جہاں وہ لیلیٰ مجنوں، شاہ سیفل اور جیون شاہ جیسے قصوں کو نظم کی ہیئت میں پیش کرتے ہیں۔

خانقاہی سلسلے سے وابستگی سے قبل بھی سوبھا فقیر ایک سیرانی طبیعت کے حامل تھے اور متعدد اسفار کر چکے تھے۔ تاہم مرشد سے ملاقات کے بعد ان کی یہ روحانی جستجو ایک واضح سمت اختیار کر گئی۔ اگرچہ فطری طور پر ان میں

روحانی محبت کا میلان موجود تھا، لیکن مرشد سے تعلق نے اس جذبے کو مزید مہمیز دی اور ان کی شاعری میں ایک نئے روحانی ذوق کا اظہار ہوا۔

ان کے کلام میں عشقِ الٰہی اور مرشد کی محبت بار بار جلوہ گر ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی عشقِ مجاز کی چنگاری بھی مسلسل ان کی تخلیقات کو حرارت بخشتی ہے۔ یہ عشق محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ وہ داخلی آگ ہے جس میں سرد و گرم کا امتزاج پایا جاتا ہے؛ ایک ایسی آگ جو جسم سے گزر کر روح تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ سوبھا فقیر نے اس آگ کو مختلف رنگوں میں برتا: عشقِ حقیقی، عشقِ اہلِ بیت، عشقِ مرشد اور عشقِ مجازی سبھی ان کے ہاں ایک مربوط نظامِ فکر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

سوبھا فقیر کا یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ محض ایک شاعر نہیں تھے بلکہ ایک صاحبِ سیرت اور صاحبِ ادراک شخصیت تھے، جنہوں نے عشق کو محض ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر روحانی تجربے کے طور پر پیش کیا۔ سوبھا فقیر کی طرح بلھے شاہؒ بھی عشقِ حقیقی کے باطنی سفر کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"بُلہا پُلیا پیر ولوں جدوں دل وچ حیرت آئی

کیسا ڈھنگ ملن دا کراں جد ہووے رسوائی

پا لباس طوائفاں والا پہلی چانجر پائی

کنجری بنیا عزت نہ گھٹدی او نچ کے یار منائیں

عشق بلے نوں نچاوے یار تے نچنا پیندا اے

سامنڑے ہووے یار تے نچنا پیندا اے" (شاہ ۱۱)

جب دل میں حیرت جاگتی ہے تو انسان ظاہری رسوم و رواج سے ماورا ہو کر حقیقت کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ ان کے نزدیک "حیرت" عقل کا پہلا زینہ اور معرفت کا دروازہ ہے، جو سالک کو وجودِ مطلق کی طرف لے جاتا ہے۔ بلھے شاہؒ اس کیفیت کو تمثیلاً ''طوائف کے لباس'' کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں، جو معاشرتی لحاظ سے رسوائی کی علامت ہے مگر درحقیقت انا کی نفی اور خودی کے خاتمے کا استعارہ ہے۔ سالک جب اپنی جھوٹی عزت، مرتبے اور نفس کو قربان کر دیتا ہے تو وہ حق کے قریب پہنچتا ہے۔ ان کے ہاں ''نچنا'' صرف جسمانی حرکت نہیں بلکہ روحانی وجد کی علامت ہے، جس میں عاشق اپنی مرضی کھو دیتا ہے اور محبوب کی رضا میں فنا ہو جاتا ہے۔ جب محبوب کی تجلی سامنے آتی ہے تو تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور سالک اپنی اصل حقیقت پہچان لیتا ہے کہ وہ خود محبوب کا عکس ہے۔ یہی کیفیت منصور حلاجؒ کے ''اناالحق'' کے مفہوم سے قریب تر ہے، جہاں فنا کے بعد بقاء کی منزل حاصل ہوتی ہے اور انسان اپنی "میں" کو مٹا کر "حق" کی آواز بن جاتا ہے۔ بلھے شاہؒ کے یہ شعر محض شاعری نہیں بلکہ روحانی فلسفے کی ترجمانی ہیں، جو انسان کو عقل و ظاہریت کی قید سے آزاد کر کے عشق و فنا کے مقام تک لے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق وہ قوت ہے جو انسان کو خدا سے جوڑتی ہے اور اسی عشق میں فنا ہو جانا انسان کی حقیقی نجات ہے

عشق بہت بڑا موضوع ہے ،جس کو اردو ادب کے اکثر شعراء نے بیان کیا ہے ۔اور خاص طور پر صوفی شعراء نے بہت ہی عمدہ نمونے سے مضمون باندھے ہیں سوبھا فقیر کی طرح محمد بخش بھی عشق کے اس لازوال موضوع پر کہتے ہیں ۔

" جس دل اندر عشق نہ راچا،او دک مردار ہے۔

محمد بخشا اوہ بندہ زندہ ،جس دا یار قرار ہے"(میاں۱۲)

جس دل میں خدا کی محبت نہیں وہ دل مردہ ہے ،جس دل میں حقیقی عشق پیدا نہیں ہوتا وہ غافل اور بے کار ہے، بلکہ ، محمد بخش نے اسے سادہ الفاظ میں "مردار" کہا ہے۔اور جس دل میں خدا کی یاد بستی ہے ،خدا کی یاد کا ڈیرہ ہے،وہ دل ہی اصل اور زندہ دل ہے۔اور صرف وہی بندہ اصل قرار و لطف سے سرشار ہوتا ہے۔ورنہ بھٹکنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔صوفیانہ روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ،زندگی صرف حیاتیاتی عمل نہیں،بلکہ روحانی کیفیت کا نام ہے،صرف وہی دل حقیقی دھڑکن ،دھڑکتا ہے ،جس میں حقیقی محبوب کی یاد بستی ہے

سوبھا فقیر ان حسین پیکروں کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ جب وہ اپنے چہروں سے نقاب ہٹا لیتے ہیں یا عاشق کے ساتھ حجاب کی دیوار گرادیتے ہیں تو عاشق ان کے حسن پر نثار ہو جاتا ہے اور اپنی ہر چیز قربان کر دیتا ہے۔ یہ کیفیت محض جمالیاتی نہیں بلکہ روحانی بھی ہے، کیونکہ نقاب کا ہٹ جانا عاشق اور محبوب کے درمیان محض ظاہری پردے کے

خاتمے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ باطنی حجاب اور فاصلہ مٹنے کی بھی علامت ہے۔ یہی پہلو سوبھا فقیر کی فکر کی بلندی اور تخلیقی بصیرت کا ثبوت ہے۔

سوبھا فقیر کی شاعری صرف معنوی اور فکری بلندی تک محدود نہیں بلکہ فنی محاسن اور شعری صنعتوں سے بھی مالامال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کافی نہ صرف روحانی مضامین کی ترجمان ہے بلکہ موسیقیت اور صوتی حسن کا شاہکار بھی ہے۔

اسی کافی میں آگے چل کر سوبھا فقیر ایک صوفیانہ مضمون کی وضاحت اس انداز میں کرتے ہیں کہ

"شاہ منصور کو بیچ چوغانہ
اناالحق کا دے کے بہانہ
غیر شرع کا جوڑ نشانہ
سولی پکڑ چڑھاتے ہو" (سوبھا۱۳)

یہ وہ مضمون ہے جو کبھی دشتِ کربلا میں امام حسینؓ سے وابستہ ہوتا ہے اور کبھی دشتِ سوس میں حسین بن منصور حلاج سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کا اصل مرکز ''حسین'' کا جذبہ اور قربانی ہے۔ سوبھا فقیر اپنے تخیل کو وسعت دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ حسین بن منصور کو شہر کے بیچوں بیچ سولی پر چڑھایا گیا، حالانکہ وہ بے گناہ تھا۔ اس کی سولی کا سبب وہ ''غیر شرعی'' باتیں قرار دی گئیں جو محض ایک بہانہ تھیں۔ دراصل منصور کا ''انا الحق'' کہنا اس کے عروجِ عبادت اور ریاضت کی انتہا تھی، جو اسے بلندیوں پر لے گیا۔

اگر ان دونوں مضامین (امام حسینؓ اور منصور حلاج) کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ منصور وہ پروانہ ہے جو خدا کے حسن و جمال کی شمع پر جل گیا۔ یہی کیفیت کربلا میں امام حسینؓ کے ایثار کی تھی اور یہی جلوہ طور پر بھی ظاہر ہوا تھا۔ اس طرح سوبھا فقیر نے صوفیانہ تاریخ کے بڑے استعاروں کو نہایت اختصار اور تاثیر کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔

فنی اعتبار سے یہ کافی نہایت پُر سلاست اور روانی سے آراستہ ہے۔ پہلے تین مصرعوں میں "چوغانہ"، "بہانہ"، "نشانہ" جیسے قوافی نظم کو نغمگی اور موسیقیت عطا کرتے ہیں، جب کہ چوتھے مصرعے کا قافیہ "چڑھاتے" مکھڑے سے جڑ کر ایک خوبصورت صوتی ربط پیدا کرتا ہے۔ ''ہو'' کی ردیف مزید ترنم پیدا کرتی ہے۔ یوں یہ کافی سوبھا فقیر کے فکری کمال کے ساتھ ساتھ ان کی فنی باریکیوں کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے۔

اناالحق کا موضوع معاشرے میں پیچیدگیاں پیدا کرتا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ سے حسین بن منصور کو سولی پر چڑھایا گیا ، سوبھا فقیر نے اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اسے صرف اور صرف ایک بہانا بتایا ہے اصل وجہ تو کوئی اور ہے ۔اسی طرح شیخ ظہورالدین حاتم اس حقیقت کو سمجھاتے ہیں کہ

" اناالحق کی حقیقت کو ،جو ہو منصور سو جانے
کہ اس کو آسمان چڑھنے سے ،چڑھنا دار بہتر تھا" (حاتم۱۴)

اناالحق کو سمجھنے کے لیے منصور بننا لازم ہے ،بغیر منصور بنے کوئی بھی شخص اناالحق کو نہیں سمجھ سکتا۔اور وہ اس حقیقت کو سمجھ جاتا ہے وہ ایسی باطنی بلندی کو چھو لیتا ہے کہ آسمانی بلندی اسے متاثر نہیں کر پاتی۔پھر دار اس کے لیے کھیل طفلی بن جاتا ہے۔اور قول اور فعل میں منصور کی جھلک پیدا ہوتی ہے

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوبھا فقیر حضرت علیؓ کی شان میں بھی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور اپنی کافی میں یوں رقمطراز ہیں کہ

"سدا دل یاد ہے پنجتن---------علیؓ ہادی ہمارا رے
توں ہے نور، نوراللہ---------منور رخ منارا رے
اسداللہ کہیں تجھ کو ----------پیغمبر کا پیارا رے
تو ہے گلشن بہشتی گل--------- بدن بادل بہارا رے

دستوں سوبھے کوں دے کوثر۔۔۔۔کرم کرو قرارا رے" (سوبھا۱۵)

سوبھے کا تخیل، اس کی روانی اور اس کی نظم میں فنی پختگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں۔ بالا کافی میں حضرت علیؓ کی حقیقت، ان کا اہلبیت سے تعلق، ان کا خدا سے ربط، ان کے القاب اور ان کی روحانی اہمیت کو نہایت خوبصورتی سے کافی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ سوبھا فقیر حقیقت شناس اور عارفانہ نگاہ رکھنے والے شاعر تھے، جنہیں نہ صرف خدا کی ذات سے عشق تھا بلکہ اہلِ بیت سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ اسی محبت کا اظہار وہ نظم کے آخر میں اس طرح کرتے ہیں کہ اگر اہلِ بیت کا خاص کرم نہ ہوا تو نہ سوبھا اور نہ کوئی دوسرا شخص اسے اپنے ہاتھوں سے آبِ کوثر دے گا، یعنی فقیر محروم رہ جائے گا۔ یہ انداز ان کی عقیدت اور روحانی ربط کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ کافی عروضی ہے اور بحر ہزج مربع سالم میں کہی گئی ہے، جس کا وزن "مفاعیلن مفاعیلن" ہے۔ فنی طور پر سوبھا فقیر نے اس میں نہایت باریکی سے تجنیسِ حرفی کا استعمال کیا ہے۔ چوتھے مصرعے میں "بدن، بادل، بہارا" اور پانچویں مصرعے میں "کرم، کرو، قرار" تجنیسِ حرفی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سوبھا فقیر محض وجدانی یا غیر عروضی شاعر نہیں تھے بلکہ علمِ عروض پر گہری دسترس رکھتے تھے۔

بہادری ،دلیری اور شجاعت حضرتِ علی رضہ کا خاصہ ہے ۔اس کی شجاعت جنگوں میں مشہور ہے ۔خیبر اس کی بہادری کے حوالے سے مشہور تاریخ ہے ۔اور تاریخ ایسی کئی مثالوں سے پر ہے۔انکی مروت و سخاوت بھی بے مثال ہے۔سوبھا فقیر کی طرح منظور عدم بھی تاریخ کے اس موضوع پر اچھی دسترس رکھتے ہیں ۔

"من ڪنت جي امر ۾ خيبر ڪيو آ ثابت

روح نبي علي آ،شير خدا علي آ"(عدم۱۶)

سوبھا فقیر ہو کہ عدم دونوں حضرت علی رضہ کی محبت کو پیش کرنے کے لیے منقبت کی صورت میں اس کی بہادری ،شجاعت اور واقعہ خیبر کواچھی طرح بیان کرتے ہیں اور دونوں میں مماثلت پائی جاتی ہے

سوبھا فقیر اپنی شاعری میں صرف کافی اور گیت ہی نہیں کہتے بلکہ "دوہا" جیسی کلاسیکی صنف کو بھی اپناتے ہیں۔ وہ ایک دوہے میں فرماتے ہیں کہ۔

"آدم سراسر ہے، کیا ہندو مسلمان

جس آدم کو لاج نہیں، وہ شیطان کا شیطان" (سوبھا۱۷)

سوبھا فقیر ایک وسیع النظر اور روادار صوفی شاعر ہیں، جو اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت کو مذہب، رنگ اور فرقہ واریت سے بلند کر کے دیکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندو اور مسلمان دراصل الگ الگ شناختیں نہیں بلکہ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، جو روحانی طور پر اپنے رب کو تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف تہذیب، تمدن، معاشرت اور عادات و اطوار کا ہے، مگر انسان کی اصل پہچان اس کا مذہب نہیں بلکہ اس کا کردار ہے۔ اچھے کردار والا انسان "اچھا" اور برے کردار والا "برا" کہلائے گا۔

اس دوہے میں سوبھا فقیر نے اپنے تخیل کو تخلیقی قوت کے ساتھ برتا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان ہونے کا دعویٰ ہی اصل حقیقت ہے۔ یہی پیغام انہیں ایک بڑے صوفی شاعر کے مرتبے پر فائز کرتا ہے۔

فنی اعتبار سے دوہا ایک قدیم اور بڑی صنف ہے جس میں بڑے بڑے قادرالکلام شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ سوبھا فقیر کا یہ دوہا غیر مساوی الوزن یا آزاد دوہا ہے، کیونکہ اس میں دونوں سطروں میں ماتراؤں کی تعداد مختلف ہے۔ پہلی سطر میں ۲۲ ماترائیں اور دوسری سطر میں ۲۷ ماترائیں ہیں۔ اگرچہ یہ وزن کے اعتبار سے آزاد ہے، مگر اس میں روانی اور تسلسل اپنی اعلیٰ ترین صورت میں جلوہ گر ہے، جو اسے غیر معمولی جمالیاتی حسن عطا کرتا ہے۔

تمام انسان آدم کی اولاد ہیں کسی بھی فرقے میں بٹنے سے پہلے ہم سب انسان ہیں۔یہ ہندو مسلمان سب بعد کے تفرقے ہیں۔انسانیت میں آدم کی کیا اہمیت ہے ! اس بات کو سمجھانے کے لیے انور حضور کہتے ہیں۔

"سيني ۾ آدم ڏسان فرقو هندو نه مسلمان

جيڪو دل سان ڏوکياء سوئي شيطان"(حضور۱۸)

پیدائشی طور سب آدمی ہیں مگر آدمی سے انسان بننے کا نصاب پڑھنا لازمی ہے اس نصاب سے گزر کر آدمی انسان بنتا ہے ،صوفیانہ روایت اور تعلیمات نے انسانیت کو بنیادی حیثیت دی ہے۔صوفیوں کے نزدیک مذہب کا حقیقی مقصد دل کو منافقت سے پاک کرنا ہے ۔اور ایک دوسرے کے لیے محبت و احترام ہی اصل انسانی جز ہے ۔جس سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔،دھوکہ ، فریب اور نفرت شیطانی کام ہیں ،جو انسانیت کے متضاد ہیں۔جس سے انسانیت کی نفی ہوتی ہے

اسی تناظر میں سوبھا فقیر ایک اور دوہے میں فرماتے ہیں کہ

"آدم سر الٰہی ہے، کیا مادہ کیا نر

جس آدم نوں لاج نہیں وہ کافر کا کافر" (سوبھا۱۹)

سوبھا فقیر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے وحدتِ آدمیت کا درس دیتے ہیں۔ وہ لفظ ''آدم'' کو بطور علامت استعمال کرتے ہیں تاکہ دنیا کے تمام انسانوں کو ایک مشترکہ رشتے میں باندھ سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جنس کی تفریق کو بھی مٹا دیتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ خواہ انسان مرد ہو یا عورت، سب کے لیے عزت، احترام اور لاج ایک لازمی جز ہے۔ اگر یہ جز مفقود ہو جائے تو انسان نافرمانیوں میں مبتلا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتا ہے، اور یہی تجاوز بے ادبی ہے۔ فقیر کے نزدیک یہی بے ادبی تمام برائیوں کی جڑ ہے، جو نہ صرف انسان اور اس کے رب کے تعلق کو متاثر کرتی ہے بلکہ انسانی رشتوں کی حرمت کو بھی پامال کر دیتی ہے۔

اس دوہے میں سوبھا فقیر نے رشتوں کی ناپائیداری کا سبب نہایت جامع اور تخلیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ فنی سطح پر یہ دوہا ترنم، روانی اور فکری پختگی سے مزین ہے، جو سوبھا فقیر کے منفرد صوفیانہ مزاج اور اعلیٰ شاعرانہ مرتبے کو اجاگر کرتا ہے۔جہاں تک اس دوہے کی فنی ہیئت کا تعلق ہے، تو اصولی طور پر دوہا چھند میں ہر سطر کی ماتراؤں کی تعداد ۲۴، ۲۴ یعنی کل ۴۸ ماترائیں ہوتی ہیں۔ لیکن سوبھا فقیر نے اس روایت کی پابندی نہیں کی۔ ان کے ہاں پہلی سطر میں ۲۳ ماترائیں ہیں جن میں دوسرے چرن میں ۱۰ ماترائیں ہیں۔ جبکہ دوسری سطر میں ۲۵ ماترائیں ہیں اور اس کے دوسرے چرن میں ۱۲ ماترائیں پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر یہ دوہا ہیئتی اعتبار سے غیر مساوی الوزن یا آزاد دوہا شمار کیا جائے گا۔ اس فنی بے ساختگی کے باوجود دوہے کی معنوی بلندی اور اس کی موسیقیت برقرار رہتی ہے، جو فقیر سوبھا کے کمالِ فن اور ان کے تجرباتی ذوق کا پتہ دیتی ہے

نتیجہ

تحقیق کے مجموعی نتائج سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ سوبھا فقیر کی شاعری اور فکری خدمات، برصغیر کی صوفیانہ روایت کی حقیقی ترجمان ہیں۔ ان کے کلام میں عشقِ حقیقی، انسان دوستی، رواداری اور وحدتِ انسانیت کا پیغام مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ سوبھا فقیر نے تصوف کو محض نظری یا فکری موضوع نہیں سمجھا بلکہ اسے عملی طرزِ حیات کے طور پر پیش کیا، جہاں انسان اپنی ذات کی نفی کر کے الوہی سچائی کے قرب تک پہنچتا ہے۔

ان کی شاعری میں امام علیؑ، منصور حلاج، اور دیگر صوفی شعرا کی فکری جھلک نمایاں ہے، مگر سوبھا فقیر کا اسلوب انہیں ایک منفرد شناخت عطا کرتا ہے۔ وہ عشق کو معرفت کا راستہ قرار دیتے ہیں اور انسان کو اس کے اخلاق، کردار اور خلوص کے ذریعے پرکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ تحقیق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ سوبھا فقیر کی تعلیمات آج کے دور میں بھی روحانی بیداری، سماجی ہم آہنگی اور اخلاقی اصلاح کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ ان کا کلام تصوف کے اُس آفاقی پیغام کی علامت ہے جو انسان کو تفرقے، نفرت، اور مادہ پرستی سے نکال کر امن، محبت اور اخوت کی طرف بلاتا ہے۔

یوں سوبھا فقیر کی شاعری، صوفیانہ روایت کی زندہ تصویر اور انسانی روح کی صدائے عشق ہے، جو ہر عہد میں دلوں کو روشنی اور امید عطا کرتی ہے

حواشی وحوالہ جات

۱۔ پروفیسر ضیاألحسن فاروقی ۔ آئینہ تصوف، پبلشر زاہد بشیر پرنٹرز لاہور: ۱۹۹۹، ص ۵۲
۲۔ ضیاألحسن فاروقی ۔آئینہ تصوف، پبلشر زاہد بشیر پرنٹرز لاہور: ۱۹۹۹،ص ۵۳
۳۔ ضیاألحسن فاروقی ۔آئینہ تصوف، پبلشر زاہد بشیر پرنٹرز لاہور: ۱۹۹۹، ص ۳۲
۴۔ پروفیسر محمد یوسف خشک۔ ڈاکٹر صوفیہ یوسف ڈاکٹر (مرتبین) ادب اور بقائے باہمی ناشر شعبہ اردو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیرپور سندھ پاکستان، ۲۰۱۳ء ص ۱۷
۵۔ خادم حسین۔ (مترجم) تصوف ، پبلشر نگارشات ۱۹۹۶ ص ۴۳

۶۔ سوبھا ۔ فقیر دیوان درد عشق،مرتب خادم الفقرا، فقیر سعداللہ لغاری، ۲۰۱۰، ص ۰۳

۷۔ بلوچ ۔نبی بخش ڈاکٹرسندھ میں اردو شاعری، پبلشر محکمہ ثقافت حکومت سندھ: ۲۰۱۲ ص ۲۲۷

۸۔ سوبھا ۔ فقیر دیوان درد عشق،مرتب خادم الفقرا، فقیر سعداللہ لغاری، ۲۰۱۰،ص ۰۸

۹ ۔ خواجہ میر درد ۔دیوان درد Vol: 003مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نیو دہلی: ۱۹۷۹، ص ۳۱

۱۰۔ سوبھا ۔ فقیر دیوان درد عشق،مرتب خادم الفقرا، فقیر سعداللہ لغاری، ۲۰۱۰۔ ص ۳٦

۱۱ ۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر۔کلام بلے شاہ،پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور:۱۹۶۴،ص ۱۲۳

۱۲۔ میاں- محمد بخش سیف الملوک ،(جلد اول) اردو پبلک لائبریری لاہور:۲۰۰۳ ص ۵۳

۱۳۔ سوبھا ۔ فقیر دیوان درد عشق،مرتب خادم الفقرا، فقیر سعداللہ لغاری، ۲۰۱۰، ص ۳۱

۱۴۔ ظہور الدین حاتم- دیوان زادہ، (مکتب خیابان ادب)لاہور: ۱۹۷۵ ص ۲۲۷

۱۵ ۔ سوبھا ۔ فقیر دیوان درد عشق،مرتب خادم الفقرا، فقیر سعداللہ لغاری، ۲۰۱۰، ص۱۱۳

۱۶۔ منظور احمد عدم ۔فکر عدم پبلشر رحمان توقیر پرنٹنگ پریس رحیم یار خان: ۲۰۱۳، ص ۱۵۲

۱۷۔ سوبھا ۔ فقیر دیوان درد عشق،مرتب خادم الفقرا، فقیر سعداللہ لغاری، ۲۰۱۰،ص ۵۱

۱۸ ۔ فقیر سید حضور بخش شاہ۔ساغر میں سمندر، پبلشر صحبت ادبی سنگت جہانپور ضلع گھوٹکی: ۲۰۱۲، ص ۵۶

۱۹۔ سوبھا ۔ فقیر دیوان درد عشق،مرتب خادم الفقرا، فقیر سعداللہ لغاری، ۲۰۱۰،ص ۵۱